

”چلواب گھر چلیں۔“ وہ بولی۔

اس نے مڑ کر غور سے اس لڑکی کو دیکھا، جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”چلو گھر چلیں۔“ وہ سانس روک کر بولی۔

”چلو۔“ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر پھر چلنے لگا۔

لیکن ان کا فلیٹ پیچھے کی طرف تھا اور وہ آگے کو جا رہے تھے۔ اسی لیے جب وہ بولی تھی: ”چلو گھر چلیں“ تو اس کی آواز میں ایک انجانے خوف کی لرزش تھی۔ اس لیے کہ وہ یہ جانتی تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ اتنے عرصے سے اس کی بیوی تھی!

اب یہ اس عظیم الشان ساحلی شر کا سب سے بڑا بازار تھا جسے وہ پار کر رہے تھے۔ پھر وہ اسے پار کرنے کے بجائے اس کے پیچوں پیچ چلنے لگے۔ وہ بازار میں چلے جا رہے تھے اور دو رویہ بجلی کی ٹیوبوں کی دودھیا سفید ہلکے ابر آلوں آسمان کی سی روشنی تھی اور دکانیں اور شوکیں جگہ گرا رہے تھے اور رکشا اور موڑیں اور گدھے اور ہر طرح کے لوگ ان کے ساتھ ساتھ بازار کے پیچوں پیچ چل رہے تھے۔ اگلے چوک تک پہنچتے پہنچتے اس نے ایک آخری کوشش کی:

”شوکی“ وہ بولی: ”ابھی تو چائے پی کر چلے ہیں۔“

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ اس نے کند آواز میں کہا۔

”گذو۔۔۔ گھر میں آکیلا ہے۔“

”مجھے بھوک لگی ہے۔“ اس نے کہا۔

چوک کو پار کر کے وہ دل کشا ہوٹل میں داخل ہوئے اور اپنی مخصوص میز پر پہنچ کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

”شوکی“ وہ بولی: ”میری بات سنو۔“

اس نے سراٹھا کر غور سے اپنی بیوی کو دیکھا۔

”چلو“ وہ بولی ”پانی پی کر چلتے ہیں۔“

”چلو“ اس نے کہا اور مینو پر جھک گیا۔

”یا بس چائے پی کر——“ لڑکی نے دوبارہ بات شروع کی، مگر اسی دم اس کا وہ انجانا خوف، جس کے باعث کچھ دیر قبل اس کی آواز لرزی تھی اور جو بار بار اس کے حلق میں آ کر انک جاتا تھا، یکسر غائب ہو گیا اور اس کی جگہ اتنی ہی قدیم اور اتنی ہی مانوس بد مرگ اور شدید مایوسی نے لے لی۔ (بہت بعد میں جا کر ایک دفعہ اس کو پتا چلا کہ یہ انجانا خوف اس شخص کا نہیں اس جذبے کا تھا۔) اس موڑ سے اس کی آشنائی پچھلے ایک برس سے تھی، جب سے کہ اس کے خاوند کا تزل شروع ہوا تھا، مگر برس بھر میں ہی اس نے ایک قدیم اور بھرپور جذبے کی شکل اختیار کر لی تھی جس سے کہ اب وہ زندہ رہنے کی قوت حاصل کر رہی تھی، وہ آزر دیگی جو ہوتے ہوتے ضد بن گئی تھی اور اب اسے سکون بخشنے لگی تھی، جیسے کہ سارے ہٹ دھرم جذبے اپنی اسی خصوصیت کے طفیل کسی نہ کسی حد تک سکون بخش ہوتے ہیں۔

”کیا کھاؤ گی؟“ اس نے مینو سے سراٹھا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“

”کچھ بھی نہیں؟“ وہ آنکھیں نچا کر بولا: ”کچھ نہ کچھ تو کھاؤ میری جان۔“

وہ دوسری طرف دیکھتی رہی۔ صرف اس کے ہونٹ بھنج گئے اور آنکھوں میں سختی آگئی۔ چند میزیں چھوڑ کر ایک نو عمر لڑکا، جو انہیں ریستوران میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنی کرسی سے تھوڑا سا اٹھ کر پھر بیٹھ گیا تھا، پر جوش لبجے میں اپنے ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن وہ ابھی بہت نو عمر تھا اور شامد پہلی بار اتنی خوبصورت لڑکی کو ایسی بیباکی سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر سفتا

اٹھا تھا اور اس سے آنکھ ملا تا ہوا گھبرا رہا تھا۔ بس چڑھ کے زور زور سے باتمیں کے جا رہا تھا اور بار بار کرسی کو گھسیٹ رہا تھا اور بہر حال اتنے فاصلے پر بیٹھا تھا کہ اس کی آنکھوں کی کشیدگی کو دیکھ نہ سکتا تھا۔

”زرد سیٹ بھی گیا۔“ وہ بولی: ”زرد چینی کا سیٹ۔“

”کس قدر افسوس کی بات ہے۔“ وہ بڑے بڑے نوالے لیتا ہوا بولا: ”تھ تھ تھ۔“

”پہلی چیز جو ہم نے خریدی تھی ——“ وہ اپنے آپ سے بولی: ”شادی کے بعد۔“

”کتنے پیسے ملے؟“

”تم پیٹ بھر کر کھاؤ شوکی۔“ وہ بولی: ”تمہیں اس سے کیا؟“

”تو کیا بھوکا مر جاؤں؟“ وہ غرایا۔

”نہیں۔“ وہ پہلی بار اس سے آنکھ ملا کر بولی: ”پیٹ بھر کر کھاؤ۔“

وہ دوبارہ کھانے پر پل پڑا۔ اس کی لمبی لمبی نازک انگلیوں کو سالن میں لتھڑتے اور بڑے بڑے لقموں کو بنٹتے اور بگڑتے اور اس کے لمبوترے، سرد اور لا تعلق جبڑے کو تیزی سے کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ بد دل سے بولی: ”کچھ تو تمیز سے کھاؤ شوکی۔“

”یہ آزاد ملک ہے۔“ اس نے جواب دیا: ”ہم آزاد ملک کے باشندے ہیں۔“ اور کھاتا رہا۔

لڑکی کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں، پھر ان میں وہی کانچ کی سی سختی آگئی اور وہ دوبارہ منہ پھیر کر نو عمر لڑکے کی طرف دیکھنے لگی۔

آخر وہ سالن بھری انگلیوں کو نیپکن سے پونچھ کر کرسی کی پشت کے ساتھ سیدھا ہو بیٹھا۔ اس کی بیوی نے سفید کھدر کے براق دھلے ہوئے، چڑھ کے

ہوئے، خالی پلیٹ میں پڑے نیکن کو دیکھا اور انہی صدی نظروں سے اس پر پھیلے ہوئے لمبے میلے سرخ اور زرد نشانوں کو دیکھتی رہی۔

پھر اس کا ہاتھ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ گود میں پڑے ہوئے پرس کو مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک وہ سیاہ چڑے کے اس لمبے سے پرس کو اپنی اپنی طرف کھینچتے رہے۔ پھر وہ بھنپنے ہوئے ہونٹوں کو نیم واکر کے دانتوں کے نیچ سے پھنکاری:

”میں دول گی۔“

وہ آہستہ سے ہنسا: ”اچھا۔“ اس نے کہا: ”تم ہی دو۔“ اور ہاتھ کھینچ کر کرسی کی پشت سے لگ کر بیٹھ گیا اور سامنے اس لڑکے کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے مٹھی بھر ریز گاری پرس میں سے نکالی اور پیسے گن کربل ادا کیا۔ بیرا خاطر خواہ ٹپ نہ ملنے پر آکڑا آکڑا میز صاف کرنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی:

”چلو۔“ وہ بولی۔

”ذرار کو۔“

”چلو۔“ وہ بولی۔

دونوں آگے پیچھے چلتے باہر نکل آئے۔ انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر نو عمر لڑکا باتیں بند کر کے ذرا سا کرسی سے اٹھا، پھر بیٹھ گیا اور اداں نظروں سے اس وقت تک انہیں دیکھتا رہا جب تک کہ وہ آنکھوں سے او جھل نہ ہو گئے۔ باہر فٹ پاتھ اور بازار میں برقی ٹیوبوں کی دودھیا سفید، ہلکے ابر آلود آسمان کی سی روشنی تھی اور ستمبر کا موسم تھا اور بھاری، نمدار سمندری ہوا آآ کران کے چھروں سے نکلا رہی تھی۔ چاروں طرف انسانوں اور گدھوں اور گاڑیوں کا ہجوم اسی طرح روایا تھا۔ وہ چلتا چلتا جا کر بس شاپ پر رک گیا۔

”چلو۔“ وہ بولی۔

وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دے کر ہونٹوں سے سیٹی بجانے اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”شوکی“ وہ ذرا نرمی سے بولی: ”پیدل چلتے ہیں۔“
”ہم تھک گیا ہوں۔“

لڑکی نے لباس انس چھوڑا: اچھا، وہ بولی ”بس میں سوؤ گے تو نہیں؟“
”نہیں۔“

تحوڑی دیر کے بعد دو منزلہ بس کو آتے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔ وہ اس کے آگے آگے اچھل اچھل کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر کی منزل میں جا کر سب سے آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بس کی دوسری منزل پر سفر کرنا ان دونوں کو بیجد بھاتا تھا۔ پہلے پہل جب ان کی شادی ہوئی تھی اور اپنے پیارے پرانے شر کی ساری جگہیں چپے چپے پیدل چل کر گھوم چکے تو بس تک خرید کر اس کی دوسری منزل میں آگے والی سیٹ پر بیٹھئے شر بھر کی سیر کیا کرتے تھے بیکار میں۔ پھر وہ اپنے شر کو چھوڑ کر اس شر میں آگئے جہاں دو منزلہ بسیں بہت کم تھیں اور صرف چند ایک خاص خاص راستوں پر چلتی تھیں۔

”اب ہم اڑ رہے ہیں۔“ وہ خوشی سے بولی۔

”ہاں“ اس نے بھی کہا: ”اب ہم اڑ رہے ہیں۔“

اب وہ بڑے بازار سے نکل کر ایک بازو کی سڑک پر جا رہے تھے جہاں پر کہ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں یا ہو رہی تھیں اور دو رویہ تاریکی میں لگے اکاڈ کا کھلی دکانوں کے روشن پونڈ پیچھے کی طرف اڑتے جا رہے تھے۔ فٹ پاٹھ اور سڑک پر ملکجی روشنی میں فاصلے کا احساس بڑھ گیا تھا اور ان دونوں کے چہرے، جو پرانے وقتوں کی رہی سی خوشی سے پل کے پل کو جگمگا اٹھے تھے، اوپر بس کی روشن کھڑکی میں جڑے دور نیچے سائیکل سواروں اور رکشاوں اور پیدل

چلنے والوں کو پیچھے کی طرف اڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔
”مکٹ؟“ کندکٹر نے پوچھا۔

جب وہ مکٹ کے پیسے نکال رہی تھی تو شوکت نے جھک کر اس کے پرس میں نظر ڈالی اور مکاری سے مسکرا�ا۔ جب کندکٹر چلا گیا تو وہ بولی:

”پتا ہے یہ کہاں سے آئے ہیں؟“

”زرد چینی کا سیٹ —“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”اس کے پیسے تو ابھی ملے ہی نہیں۔“

”پھر؟“

”سرخ ساری کے ہیں۔“

”کون سی والی؟“

”جو پارسال عید پر تم نے دی تھی۔“

بس ایک دھنکے سے شاپ پر رک گئی۔ انہوں نے اپنے پاؤں کے قریب گلی طاپتی میں سے دیکھا کہ ڈرائیور نے ابن صفحی کا ناول پلٹ کروہاں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ جماں پچھلے شاپ پر اس نے چھوڑا تھا۔ چند لوگ اوپر آئے اور ادھر ادھر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے ناول الثاکر کے سٹیرنگ کے پاس رکھا اور بس پھر روانہ ہوئی۔

”یہ ساری۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر بزرگ کی میں ریشمی ساری کو پھووا: ”میں نے ڈرائیور میں خریدی تھی۔“

”شوکی“ اس کی آنکھوں کی کانچ کی سی سختی آن کی آن میں غائب ہو گئی اور وہ اس کی طرف جھک کر جذباتی لمحے میں بولی: ”یہ اکلوتا تحفہ ہے جو شادی

سے پہلے تم نے مجھے دیا تھا۔“

”میں چھ ماہ تک اس کے لیے پیسے جمع کرتا رہا تھا۔“ اس نے کہا: ”گھر سے خرچ اتنا کم ملتا تھا۔“

”اور یہ سب سے پہلا تحفہ ہے جو تم نے مجھے دیا تھا۔ یاد ہے؟“

”تمہیں سبز رنگ بھاتا تھا۔“

”اور تمہیں چھوٹے چھوٹے تھنے دینے سے ایسی شرم آتی تھی۔“ وہ آہستہ سے ہنسی: ”تم مجھے کوئی قیمتی تحفہ دینا چاہتے تھے۔“

”اب بھی۔“ اس نے دوبارہ ہاتھ بڑھا کر چھوا: ”بالکل نہیں ہے۔“

”شوکت——“ وہ دہل کر بولی، پھر اس نے نرمی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا: ”میں اسے کبھی نہیں بخوبی گی شوکی۔“

”اب بھی یہ بالکل نہیں ہے۔“

”میں اسے کبھی نہیں بخوبی گی۔“ وہ پھر بولی: ”شوکی یہ تمہارا سب سے پہلا——“

”تمہارے پاس اور بھی ہیں۔“ وہ یک لخت چڑ کر بولا۔

”کہاں ہیں؟“

”جو ریاض نے تمہیں دی ہیں۔“ اس نے کہا: ”ہرے رنگ کی سستی۔“

”وہ——!“ اچانک صدمے سے ایک لختے کو اس کی پتلیاں پھیلیں، پھر اپنی جگہ پر آ گئیں اور وہ اپنے آپ پر قابو پا کر بولی: ”وہ بھی گئیں۔“ ”کہاں؟“

”جہاں اور سب گیا۔“

وہ سامنے رکھتا رہا: ”ان کا کیا ملا ہو گا۔“ اس نے کہا۔

وہ خاموش بیٹھی خفت سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

”ہرے رنگ کی سستی سستی۔“ اس نے دو ہرایا۔

”سستی نہیں تھیں۔“

”ایسا ستا آدمی ہے۔“ وہ بد مزگی سے ہنسا: ”ہمارا دوست۔“

”شوکت!“ وہ کانچ کی سی آنکھیں سکیڑ کر پنجی آواز میں چھپی۔

اس کے بعد دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اگلے شاپ پر وہ گلدار گڑیا کی طرح چلتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر کر فٹ پاٹھ پر آگئی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ جب وہ اپنے فلیٹ کی طرف مرنے لگے تو وہ رک کر بولی:

”شوکت،“ میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔“

”کہاں؟“

”جہاں بھی مل جائے۔“

”مبارک ہو۔“

پتھر کا انڈھا سازینہ چڑھ کر دوسری منزل پر اس نے اپنے فلیٹ کے دروازے کو چابی لگائی اور وہ اندر داخل ہوئے۔ بڑے سے کمرے کا فرش اور دیواریں تنگی اور کھڑکیاں بند تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک میز پر چند کتابیں پڑی تھیں اور ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ فرش پر دو تین کھلونوں کے درمیان ایک بچہ سورہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ بھاگ کر گئی اور اس کے اوپر جھک گئی۔ بچے کے میلے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں بنی تھیں۔ اس نے اس کا ما تھا چھووا، پھر گال پر ہاتھ پھیرا، پھر احتیاط سے بازوؤں میں اٹھا کر اسے چوما اور دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑا خالی خالی آکتائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے انتہائی آنکھ کے ساتھ وہیں کھڑے کھڑے اپنے کپڑے

اتار اتار کر فرش پر گرانے شروع کیے۔ جب سارے کپڑے اتار چکا تو دوسرے چھوٹے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ ایک چھوٹے سے بستر پر بچہ سورہا تھا۔ دیوار کے ساتھ چند صندوق رکھے تھے۔ دو چار کھونٹیاں تھیں جن پر کپڑے منگے تھے۔ ایک میز تھی جس پر ہینڈ بیگ پڑا تھا۔ دیوار پر بلب بلب رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک چھوٹے بستر پر بیٹھی بچے کے جسم پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر اس نے انٹھ کر ساری اتاری اور اسے احتیاط سے تھہ کر کے میز پر رکھا، پھر دونوں کمروں کی بقی بچانے اور سڑک پر کھلنے والی کھڑکی کو کھولنے کے بعد خاموشی سے جا کر اس کے برابر لیٹ گئی۔

ایک پتنگا بڑی دیر سے کھڑکی کے ٹیشول پر سرما رہا تھا اور اندھیرے میں اس کے پروں کی کند، مدھم آوازیں اور سوتے جاگتے ہوئے انسانوں کی سانسوں کی پھنکار ابھر رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی مدھم سی روشنی پھیلاتی ہوئی سڑک پر سے گزر جاتی۔

”اوہ ہنک!“ پھر وہ بولی: ”نہیں۔“

وہ بلے کی طرح حلق میں غرایا۔

”نہیں شوک!“ وہ پھر بولی: ”میرا جی نہیں۔“

”فاختہ۔“ وہ خوشامد کے لبھے میں بولا: ”میری نخنی سی، پیاری سی فاختہ!“

”خدایا۔“ اس نے زاری کی: ”خدایا۔“

پھر پتنگے کو شاید باہر جانے کا راستہ مل گیا اور اندھیرے میں صرف سانسوں کی مدھم پھنکار رہ گئی جو بلند ہوتی کچھ دیر کے بعد ماتھی سرد آہوں میں تبدیل ہو گئی۔ کمرے میں سخت جس ہو گیا۔

پھر وہ انٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے تک کمرے کے وسط میں بازو لٹکائے کھڑا

رہنے کے بعد وہ اندر گئے میں چلتا ہوا بڑے کمرے میں گیا اور نیبل لیپ جلا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کہنیاں میز پر رکھے اور بازو سیدھے میز پر پھیلائے اور سفید کاغذ پر نظریں جھائے وہ دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ اب اس کے بدن میں کامل امن تھا۔ ایک ایک جوڑ ایک ایک پور ایک ایک نس اپنی اپنی جگہ پر عین فٹ ٹھیک ٹھاک بیٹھی تھی اور خون یوں دوڑ رہا تھا جیسے کسی جدید ترین سڑپیم لا یسٹڈ مشین میں تیل ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتا ہے اور سانس یوں چل رہی تھی جیسے نیم کے پیڑ میں ہوا ایک ایک پتی، ایک ایک ریشے سے لپٹتی ہوئی بڑی روانی سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ وہ ایک ذہن آدمی تھا اور ابھی ابھی ایک اشکچول کی سی سندی سے اپنی بیوی کے ساتھ محبت کر چکا تھا۔ اور بڑی آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے بے دم ہوا بیٹھا تھا اور خیالات بغیر کسی دقت کے بغیر کسی کوشش یا ارادے ہی کے آپ سے آپ ذہن میں آتے چلے جا رہے تھے۔ ”اب میں لکھوں گا۔“ اس نے سوچا۔ وہ ہمیشہ یہی سوچتا تھا اور کاغذ سفید کا سفید رہتا تھا۔ اس لئے کہ دل کی سوزش ابھی باقی تھی۔

پھر متوجہ آنکھوں سے وہ دروازے میں نمودار ہوئی اور ہولے ہولے چلتی ہوئی آکر میز کے ایک کونے پر بیٹھ گئی اور اسے دیکھنے لگی۔ اور اسے اس کا ایک سال پہلے تک کاسنگ مرمر کی چمک والا تیر کی طرح سیدھا دیلا پتلا مگر رگ و ریشے والا، پھر کتے ہوئے، اچھلتے اور کوئتے ہوئے پھوٹوں والا اور پوری طرح احاطہ کرتی ہوئی گردش والا اور نو عمر لڑکوں کی سی گریس والا محبوب اور میریان بدن یاد آیا جواب تند خوا اور زہر دیلا ہو چکا تھا اور کوئی رابطہ کسی سے نہ رکھتا تھا اور مشین کی طرح سرد مہر تھا۔ پھر اس نے بھی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہا۔

زور رنگ کی دیوار کے ساتھ ذرا سی ٹیک لے کر بیٹھی ہوئی وہ ”رینوا“ کی

رس بھری، شاداب بدن کنواریوں کی یاد دلاتی تھی اور کوئی نہ کہ سکتا تھا کہ اس عورت نے ایک بچہ جنا ہے اور دو سال تک اسے دودھ پلاتی رہی ہے۔ نیبل لیپ کی گلابی روشنی میں اس کا انگ انگ جما ہوا بدن، بڑی اٹھان والا اور بڑے جھکاؤ والا اور بڑا پراسرار بدن مددھم میالے سے زرد رنگ کا تھا اس طرح کہ دیوار کے ساتھ ایک ہو گیا تھا اور دیوار سے الگ بھی تھا اس وقت اس گونگے اور بھرے اور بے خیال بدن، اس عاجز اور لا وقت بدن، اور باوجود ان سب کے بڑے ہی زرخیز اور تقریباً جلاوطن بدن کو دیکھ کر اس کے دل میں افسوس پیدا ہوا۔ اور اس وقت اسے ماضی کی یاد آئی۔

اس لئے کہ ماضی کا بھی اپنا ایک رنگ تھا، مددھم میالہ زرد سارنگ جوان ساری چیزوں کا رنگ تھا جو ماضی میں رہتی تھیں۔۔۔ بہت پسلے جب وہ چھوٹا سا لڑکا تھا اور سوریے سویرے اٹھ کر سکول کو جایا کرتا تھا اور نوکر ساتھ ساتھ بستہ لئے ہوتا تھا اور بستہ باندھنے کے بھی دو طریقے تھے۔ ایک دو گانٹھ والا تھا اور ایک ایک گانٹھ والا۔ یعنی دائیں بائیں کے پلوؤں کو بھی گانٹھ دیتے تھے اور آمنے سامنے کے پلوؤں کو بھی گانٹھ دیتے تھے اور یہ ایک طریقہ تھا۔ یا پھر آمنے سامنے کے پلوؤں کو نیچے اوپر تھہ کر کے رکھتے تھے اور دائیں بائیں کے پلوؤں کو اوپر گانٹھ دیتے تھے اور یہ دو سرا طریقہ تھا۔ اور کبھی ایک طرح سے باندھتے تھے اور کبھی دوسری طرح سے، اور جی کرتا تھا خود اٹھاتے تھے جی کرتا تھا نوکر سے اٹھاتے تھے اور اپنی مرضی کے خود آپ مالک تھے اور جو جی میں آتا تھا کرتے تھے۔ یعنی جی میں آتا تھا تو رستے میں رک کرنے نہیں رنگ دار کنکر جمع کرنے لگتے تھے اور پھر صاف سی جگہ پر بیٹھ کر ان کا نشانہ کرتے تھے اور نوکر کے جاتا تھا: ”بھیا اسکول کو دیر ہو جائے گی۔ بھیا پھر خاں صاحب ناراض ہوں گے۔“ اور اس کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے کہ اس

کی اپنے سامنے کوئی طاقت نہ تھی۔ پھر وہ رستے میں نیم کا ایک پیڑ پڑتا تھا کہ جس پر چڑھتے ہوئے جانا گویا فرض تھا۔ اس لئے کہ اس کی بے شمار شاخیں تھیں جن پر چڑھنا بڑا آسان تھا اور اور ان گنت پتیاں تھیں ہوا جن کے پیچ سے ہو کر بڑی آسانی اور روانی سے چلتی تھی اور دو موٹی موٹی شاخوں پر پیر جما کر پتوں کے اندر ہوا کے رخ منہ کر کے کھڑے ہونا بڑا ہی اچھا لگتا تھا۔ پھر ایک روز آتا تھا کہ بقر عید ہوتی تھی اور اب تو گرمیوں میں آتی ہے مگر تب بڑے جائزوں میں آیا کرتی تھی اور رات بھر مندی لگے، اخبار کے کاغزوں میں لپٹے ٹنڈ منڈ ہاتھوں کو گود میں دیئے کبھی جا گے کبھی سوئے رہتے تھے اور سوریے اٹھ کر دانتوں سے ماؤں کو کھولتے اور کاغذ اتارتے تھے تو سوکھی مندی کے پڑپڑے نیچے گرتے تھے اور انگلیاں سیدھی نہ ہوتی تھی۔ مگر جب پانی میں ڈال کر ہاتھوں کو دھوتے تھے تو ان کا آتشی گلابی اور سرخ رنگ نکلتا تھا جو فخر سے ایک دوسرے کو دکھاتے تھے اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ہمارا سب سے شوخ رنگ نکلا ہے۔ پھر اس کمرے میں جاتے تھے جہاں صندوق پڑے ہوتے تھے اور جہاں رات کو مندی لگانے اور سونے سے قبل سب کے عید کے نئے سلے ہوئے جوڑے نکال کر بکسوں، صندوقوں اور پیٹیوں پر پھیلایا دیئے گئے ہوتے تھے۔ نمانے سے پہلے ایک نظر اور ان کو ضرور دیکھ لیتے تھے۔ پھر نہاد ہو کر اور نئے کپڑے پن کر ابا کے ساتھ نماز کو جاتے تھے۔ نماز کے بعد گھر آ کر صرف عیدی لینے کو رکتے تھے اور گلیوں میں بھاگتے ہوئے ماموں کے گھر پہنچتے تھے جہاں سے الگ عیدی لیتے تھے۔ پھر وہاں سے میلے کارخ کرتے تھے۔ میلے پر میٹھی اٹی کھاتے تھے اور جھولوں پر خوب ایک دوسرے سے لپٹ کر آنکھیں میچ کر بیٹھتے تھے اور گھروپس آتے آتے ابا کے نام کا بکرا ذبح بھی ہو چکا ہوتا تھا۔ مگر اصل بات تو اگلے روز ہوتی تھی جب سوریے سویرے منہ انڈھیرے ابا میاں آ

کر جگا دیتے تھے اور صبح سوریے یوں جگا دیئے جانے پر دل بڑا خفا ہوتا تھا اور گرم گرم بستر ہی میں کسما کر سو جاتے تھے۔ مگر ابا میاں تھے کہ ننگی چھری ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے اور کہے جاتے: ”شوکی بیٹا“ بس ذرا اس کو ہاتھ لگا دو۔ شوکی بیٹا — پھر جب آنکھیں مل کر کھولتے تو صبح سوریے کی ملکجی روشنی میں چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر چونک پڑتے اور انہ کر بیٹھ جاتے اور ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر اسے ذرا سا چھو دیتے اور ابا میاں اسے پکڑے پکڑے باہر چل دیتے۔ مگر نیند اس کے بعد نہ آتی۔ چنانچہ مفلر کانوں پر لپیٹ کر، ہاتھ بغلوں میں دے کر سردی کے مارے کپکپاتے ہوئے ابا کے پیچھے پیچھے نکل آتے۔ باہر صبح کی روشنی اچھی خاصی ہوتی اور وہ نظارہ ہوتا، وہ جو دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی مگر دیکھے جاتے۔ قصائی بکرے کو نالی پر گرانے اسی چھری سے ذبح کر رہا ہوتا اور ابا پاس کھڑے ہوتے اور خود ابا کے پیچھے پیچھے ایک آنکھ نکال کر سرخ سرخ گاڑھے خون کو بہ کر نالی میں جاتے، اور زمین پر ٹانکیں چلاتے پھر کتے، کپکپاتے اور کئے ہوئے حلق سے گر گر کی آواز نکالتے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسمان کو تکتے ہوئے بکرے کو دیکھے جاتے دیکھے جاتے اور دل میں بیک وقت خوف زدہ اور بڑا ہی اچھا محسوس کرتے — اب یہ ساری چیزیں مدد ہم سے میاں سے زرد رنگ کی تھیں اور ماضی کی اس عجیب و غریب سر زمین پر رہتی تھیں جہاں سے اس کو دیں نکالا مل چکا تھا۔

پھر ایک روز پتا چلا کہ ابا فوت ہو گئے۔ ان کا لباسا تابوت صحن میں رکھا تھا اور گھر میں رونے چلانے کی آوازوں کے باوجود عجیب سی گونجتی ہوئی خاموشی تھی۔ ایک بڑی عجیب بات یہ تھی کہ اب تک ابا کے بارے میں اس کی یاد صرف اس تابوت کے حوالے سے تھی۔ جب بھی ابا کا ذکر آتا یا ان کی یاد آتی صرف وہ تابوت آنکھوں کے سامنے آتا اور وہ نہ آتے۔ اب یہ ساری باتیں

بھی اسی زرد سے رنگ و بو کی ماں تھیں۔

پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ پھر وہ اچانک غریب ہو گئے۔ پھر وہ نوکرا اور اپنے سامنے اس کی کم مائیگی کا احساس اور وہ لاپرواٹی اور بقرا عید کے بقرا عید وہ دل دوز نظارہ — کچھ بھی باقی نہ رہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑا ہونا شروع ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

”جال“ اس نے پہلی بار بیوی کا نام لے کر نرمی سے کہا: ”کپڑے پن لو۔“

وہ انھی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی: ”چلو۔“

انہوں نے دونوں کمروں کی بتیاں گل کیں اور ساتھ ساتھ لیٹ گئے۔ اب چاروں طرف تاریکی تھی اور جس سے دم گھٹا جا رہا تھا اور اسے پھر ماضی کی یاد آئی، کہ ماضی ایک وسیع و عریض، آسودہ حال اور زرد رنگ کی روشن سرزمین تھی جیسے صبح ہوتی ہے۔ اور ایک وہ لڑکی تھی گلی کے موڑ پر جس کا گھر تھا اور جس سے اس کی بڑی گمراہی نسبت تھی۔ ایسے کہ دونوں ساتھ ساتھ سکول کو جاتے تھے اور وہ چھٹے درجے میں تھا اور وہ پانچویں میں تھی اور کبھی ایک کے گھر میں اور کبھی دوسرا کے گھر میں دونوں پسروں مل کر کھلتے رہتے تھے۔ اس کی جلد گائے کے مکھن کی سی اسی ہلکے زرد رنگ کی تھی اور اسی طرح ملائم اور چکنی اور بے داغ تھی۔ جب وہ ہنستی تھی تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے تھے اور آنکھوں میں جگنوں کی قطاریں چلتی تھیں اور گلے سے گھنٹیوں کی آواز آتی تھی۔ اور وہ ہمیشہ سر پیچھے پھینک کر ہنستی تھی۔ اس کا نرخہ اوپر نیچے کانپتا رہتا تھا اور اس کا جی بے اختیار اسے چھونے کو کرتا تھا۔ پسروں تک وہ اس کے گلے پر اور گلے سے نیچے سینے کی جلد پر اور بازوں پر انگلیاں دوڑا تا گد گدی کرتا نہ تھکتا تھا اور جب گھر کو لوٹتا تھا تو ہر روز بست اداں ہو جاتا تھا۔ وہ ہر دم ہنسا کرتی

تھی اور اسی طرح ایک روز ہستے ہستے بولی تھی: ”میرا پیٹ دیکھو گے؟“ اور کپڑا ہٹا کر کھڑی ہو گئی تھی اور نیچے اس کا پیٹ بہت چھٹا، کمر کے ساتھ لگا ہوا، سنہرے زرد رنگ کا ملائم اور بے داغ تھا اور ناف کے اندر ہلکا ساسایہ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے پیٹ پر رکھ دیا تھا اور رکھے رہا تھا اور وہ کھڑی رہی تھی چپ چاپ۔ پھر اچانک اس نے پیٹ سے ہاتھ اٹھا کر اس کی قیض پر رکھ دیا۔ : ”اے اتار دے۔“ اس نے کہا تھا: ”اور اسے بھی۔“ وہ اس کے دوسرا کپڑے کو چھو کر بولا تھا: ”تیرا بدن دیکھوں گا۔“ اور اسی طرح نہیں سے دہری ہوتے ہوئے اس نے کپڑے الگ کر دیئے تھے اور ہاتھ آگے باندھ کر اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی تھی اور خاموش نہیں سے سارے بدن میں کپکپاتی رہی تھی، کپکپاتی رہی تھی۔ اور سحر زدہ سا بیٹھا بیٹھا اس کے لمبی لمبی ٹانگوں والے اور تنگ محراب کوالوں والے اور کمان کی طرح تنی ہوئی ریڑھ کی ہڈی والے اور دبلے پتلے شانوں والے اور سنہری سنہری روئیں والے ہلکے زرد بے داغ اور نو عمر بدن کو ذکھتا رہا تھا اور اس کا اپنا بدن ایک دم ہلکا سا ہو گیا تھا جیسے کہ وہ ابھی اوپر اٹھ کر اڑنے لگے گا اور اسے دل میں بڑا ہی اچھا لگا تھا۔ اور یوں اس لڑکی کا یہ روپ اس کے دل پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی اس کا ذکر آیا یا اس کی یاد آئی اس کا یہی روپ نظر کے سامنے آیا وہ نہ آئی۔ ماضی کے نخلستان میں اس نیم کے پیڑ اور اس لڑکی کی ایک ہی رنگ و بو تھی کہ دونوں دل کو ہلکا کرتے تھے اور بدن میں اڑان پیدا کرتے تھے اور جی کو بڑے ہی اچھے لگتے تھے۔

جس روز رات کو ہیئے سے وہ مری ہے اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ سوریے گھر میں کسی نے اس سے ذکر نہیں کیا۔ صرف ان کے گھر کے آگے سے نکلتے ہوئے اس نے ایک ہنگامہ ساویکھا اور بے سوچ سمجھے سکول چلا گیا۔ پھر آدمی

چھٹی کے وقت میں وہ اسے سارے میں ڈھونڈتا پھرا اور اسے کہیں نہ پا کر سخت مایوس ہوا۔ جب وہ سکول سے لوٹا تو وہ اسے دفا کے بھی آچکے تھے۔ وہ ان کے گھر بھر میں پھرتا رہا اور کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ پھر وہ ان کے کوٹھے پر جا چڑھا اور اس جگہ جا کر بیٹھ گیا جہاں اس نے اس کا وہ روپ دیکھا تھا۔ بڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے اٹھا اور چوبارے کی کھڑکی سے سرنکال کر بے مدعا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی نظر اپنے مکان پر پڑی اور وہ حیران رہ گیا۔ اس نے بارہا یہاں سے اپنے مکان کو دیکھا تھا مگر پہلے کبھی اسے اس کی خست حالی کا ایسا احساس نہ ہوا تھا۔ ان کا مکان دھوئیں کے رنگ سے بدرنگ ہو رہا تھا اور اس پر بارش کے پانی کی لکیرس بنی ہوئی تھیں اور چوبارے کی ایک دیوار ٹوٹی ہوئی تھی اور انیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ اس وقت اس نے دل میں ارادہ کر لیا کہ بڑا ہو کروہ ایک امیر آدمی بنے گا۔

اپنی بیوی کے پیٹ پر ہاتھ رکھے رکھے وہ سو گیا۔

اگلے روز سوریے وہ ریاض کے جمکتے ہوئے دفتر میں بیٹھی تھی۔ وہ آگے کو جھک کر تقریباً کرسی کے کنارے پر بیٹھی تھی اور ساتھ والی کرسی پر اس کا بچہ بیٹھا پاؤں ہلا رہا تھا اور چھٹ کو گھور رہا تھا۔ سامنے ریاض گھونمنے والی کرسی پر بیٹھا اپنی وسیع و عریض میز کے شیشے پر کہنیاں رکھے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

”شوکت کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ٹھیک ہے؟“

وہ بے دل سے اپنے ناخنوں کو گھورتی رہی۔

”انگل۔“ بچے نے کہا: ”میں پڑھوں گا۔“

”کہاں پڑھو گے گذو؟“

”کہاں؟“ بچے نے کہا: ”کتاب پڑھوں گا۔“

”ہاہا۔“ ریاض ہنسا: ”ابھی تو تم بہت چھوٹے ہو بیٹے۔“

”میں چار سال کا ہو گیا ہوں۔“

”ہاں ہا۔“ اس نے میز کی دراز سے چند اور ٹافیاں نکال کر بچے کو دیں جو وہ لے کر کھانے لگا۔

”ریاض“ وہ اور آگے کو جھک کر بولی: ”میں نوکری شروع کرنا چاہتی ہوں۔“

”کہاں؟“

”جہاں بھی مل جائے۔“

وہ بڑی دیر تک اسے گھری نظروں سے دیکھتا رہا، پھر بولا: ”تم میرے ساتھ کام کر سکتی ہو، چاہو تو۔“

”نہیں۔“ وہ بولی: ”اپنی پرانی جگہ کا پتا کرتی ہوں۔“

”کانج میں؟“

”ہاں۔“

”وہ ابھی تک خالی تھوڑا ہو گی۔“ اس نے کہا: ”دو سال ہو گئے۔“

”شاید ہو۔“

”امی۔“ بچے نے کہا: ”مجھے کو کتاب لے کر دو۔“

”اچھا۔“

”ڈی ڈل ڈی ڈل ڈی ڈل ڈو۔“

”گذو۔“ وہ بولی: ”خاموش بیٹھو بچے۔“

”انکل مجھے کتاب لے کر دو۔“

”ابھی لے کر دیتے ہیں بیٹے۔“

پھر وہ اٹھا اور میز کے نچلے دراز سے ایک چوڑا سانفاست سے بندھا ہوا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا۔

”نہیں ریاض۔“ وہ دہل کر بولی: ”نہیں۔“

”جال۔“

”نہیں ریاض۔ اسے اپنے پاس رکھو۔“

”مگر آخر کیوں — جال؟“

وہ اپنے سامنے میز پر پڑے پیکٹ کو گھورتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی:

”ریاض اسے پتا چل گیا ہے۔“

”کس بات کا؟“

”ساری ساریاں جو تم نے مجھے دی ہیں۔“

”میں نے اس سے چوری تو نہیں دیں۔“

”میں نے اسے کبھی نہیں بتایا بہر حال۔“

”بہر حال۔“ وہ لاپرواٹی سے بولا: ”کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر میں تم سے اتنی۔“

”ریاض۔“ وہ جیسے اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”اچھا چلو نہ سی۔“ وہ ہنسا: ”مگر ہم اتنے پرانے دوست تو ہیں کم از کم

“

”ریاض۔“ وہ بولی: ”خدا کے لئے —“

وہ اٹھ کر آفس میں پھر نے لگا۔

”امی۔“ بچہ پیکٹ سے کھیلتا ہوا بولا: ”یہ کیا ہے؟“

”چکھ نہیں ہے۔“

”ذی ذل ذی ذل ذو ذل ذا۔“

”گڈو چپ رہو۔“

”جال۔“ وہ آکر اس کے قریب میز پر بیٹھ گیا: ”صرف ایک سال پلے تک تم کتنی خوش تھیں، یاد ہے؟ میں تمہیں دیکھتا تھا تو میرے دل میں روشنی ہو جایا کرتی تھی۔ میں تمہیں کھوچ کا تھا مگر خوش تھا، اس لئے کہ تم خوش تھیں۔“

”ریاض!“

وہ پھر اٹھ کر کمرے میں پھرنے لگا: ”جال، آخر ہوا کیا ہے؟ بتاؤ۔ آخر ہوا کیا ہے؟“

”مجھے کچھ پتا نہیں ریاض۔“ وہ ماہی سے سرہلا کربولی۔

”وہ ایک سیدھا سادہ نارمل اور ذہین انسان تھا، اور ——“ وہ اداسی سے بولا: ”برا خوش بخت آدمی تھا۔ ہم ساری عمر سے اسے جانتے آئے ہیں، اس کے ساتھ رہے ہیں، پھر یہ بیٹھئے بٹھائے اس کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ جال، مجھے شک ہوتا ہے کہ تمہیں سب پتا ہے مگر مجھ سے چھپا تی رہی ہو۔“

”مجھے کچھ پتا نہیں ریاض۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ہر وقت کھاتا رہتا ہے یا سویا رہتا ہے یا مسخرے پن کی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ میں سوریے سے شام تک باتمیں کرتی ہوں اور میری کوئی بات نہیں سنتا، کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ جو پیسے ہوتے ہیں ضائع کر دیتا ہے، اور ——“ اس نے اس کی تند، حیوانی محبت کا ذکر کرنا چاہا مگر رک گئی: ”گھر میں کچھ بھی نہیں رہا۔“ آخر وہ بولی۔

ریاض چلتا چلتا کھڑکی کے آگے رک گیا۔ پھر اس نے کھڑکی کھولی اور دونوں ہاتھ اس پر رکھے رکھے نیچے سڑک پر دیکھتا ہوا بے خیال سے بولا: ”جال، یاد ہے وہ دن جب یونہیں کے ایکشن میں اس نے مجھے ہرایا تھا؟ اس روز ووٹنگ

کے نتائج برآمد ہونے پر اس نے بڑی فراغ دل سے میرے سامنے آ کر مصائب کو ہاتھ بڑھایا تھا اور میں نے منہ پھیر لیا تھا۔ تم شاف روم کے سامنے کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔“

وہ خاموش بیٹھی میز کے شیشے پر ناخن سے لکیریں کھینچتی رہی۔

”بعد میں جب میں جھنڈیاں لگے ہال میں تنارہ گیا اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور شکست کی بہت ساری خفت میرے دل سے نکل گئی تو بڑے زور کی آندھی آئی تھی اور میں نے برآمدوں میں اڑتے ہوئے اپنے اور اس کے پوسٹروں کو دیکھ کر سوچا تھا: ”یہ شخص واقعی تمہارے قابل ہے۔“ اس روز میں اپنی زندگی کے اس موڑ پر آگیا تھا جہاں سے پھر کبھی واپسی نہیں ہوئی۔ اس روز اس نے ہمیشہ کے لئے تمہیں مجھ سے جیت لیا تھا۔

”ریاض۔“ وہ بولی: ”ان بالتوں کو یاد کرنے سے اب کیا فائدہ؟“

”تمہیں پتا ہے جال۔“ وہ مژکر دیوار کے سارے کھڑا ہو گیا: ”نوجوانی کے دلیر دنوں میں گرا ہوا آدمی پھر کبھی جنم کر کھڑا نہیں ہوتا۔“

وہ جھلملاتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

پھر وہ آہستہ سے ہنسا اور آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”مگر یہ بات۔“ اس نے ہوا میں ہاتھ پھیلا کر سوال کیا: ”میرے لیے اب ایک راز بن چکی ہے۔ کوئی واقعہ، کوئی حادثہ، کچھ بھی تو نہیں ہوا،“ پھر یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے جمال؟“

”مجھے کچھ پتا نہیں۔“ وہ روکر بولی: ”مجھے کچھ پتا نہیں۔“

”امی۔“ بچے نے کہا: ”امی۔“ پھر اس نے کہا: ”انگل۔“ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔

پھر وہ آنکھیں خشک کر کے انٹھ کھڑی ہوئی۔